نو افسانے، ایک کہانی

ابنِ مُنیب

نو افسانے، ایک کہانی

اِبنِ مُنیب

نو افسانے ایک کہانی از ابنِ منیب

کور امیج: خرم امتیاز، نائف پینٹنگ

ای میل ibnay.muneeb@gmail.com

سائٹ naveedrazzaqbutt.wordpress.com

صفحہ facebook.com/ibnay.muneeb

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔۔۔

دردمندوں کے نام

تعارف

بسم اللہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ۔

صفحہ صفحہ گزر رہے ہیں دِن
ہم ہیں کردار اِک فسانے کے!

'بارہ افسانے' کے تقریباً چار سال بعد 'نو افسانے، ایک کہانی' کے عنوان سے میرا دوسرا نثری مجموعہ پیشِ خدمت ہے۔ اس میں وہ افسانے (اور کہانی) شامل ہیں جو میں نے نومبر ۲۰۱۵ سے اب تک لکھے۔ کہتے ہیں کہ ہر پڑھنے والا ایک مختلف کتاب پڑھتا ہے۔ دیکھیے آپ اِس کتاب میں کیا پڑھتے ہیں۔ اِس سلسلے میں اپنی آراء اور اپنے خیالات سے ضرور نوازیے گا۔

بہت شکریہ،

ابنِ منیب

فروری ۲۰۲۰

فہرست

۱

ہیئربرش

"گدھا"!

اماں نے برش زور سے زمین پر پٹخا۔ پاس بیٹھے ہوئے راحیل کا دل دہل گیا۔ اُس نے اپنی ماں کو یوں بے قابو ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ناراض ہوتے دیکھا تھا، بچپن کی پٹائی اور ڈانٹ بھی یاد تھیں، پر اِن میں کبھی ایسی بے بسی نہیں تھی جو اب اماں کے چہرے پر تڑپ رہی تھی۔

"صاف ہی نہیں ہو رہا۔ پھنسے ہوئے ہیں بال بُری طرح۔ ٹائم کتنا بچا ہے۔ اور شام کو تُو نے چلے جانا ہے۔"

آج صبح ناشتے کے بعد جب راحیل اپنا سوٹ کیس تیار کرنے لگا تھا تو اماں اُس کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ راحیل یہ دیکھ کر خوش ہوا تھا، کیونکہ کچھ دنوں سے ماں

اُس سے خفا خفا لگ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ اُس کی پیک کی ہوئی کسی چیز کو اُٹھاتی اور بہتر سلیقے سے تہہ کر کے دوبارہ سُوٹ کیس میں رکھ دیتی۔ اِدھر اُس نے ایک قمیص رکھی اُدھر اماں نے اُٹھا کر کالر ٹھیک کیا، تہہ شدہ قمیص پر ہاتھ پھیرا اور پھر اُسی جگہ رکھ دی۔ اِسی خاموش کاروائی کے دوران اماں کی نظر اُس کے ہیئر برش پر پڑی تھی۔ نہ جانے کتنے عرصے کے بال برش کے دندانوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔

" کبھی صاف بھی کر لیا کر اِسے " !

یہ کہتے ہوئے اماں نے ہیئر برش سُوٹ کیس سے اُٹھالیا تھا اور کچھ دیر سے اُس میں پھنسے بالوں سے مقابلہ کر رہی تھی۔ اماں کی کوششوں سے بے خبر، پیکنگ کی بے مغز حرکات کے بیچ راحیل شام کے سفر کی تفصیلات ذہن میں دوڑانے لگا تھا۔ تین گھنٹے پہلے ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔۔۔ پاسپورٹ ٹکٹ رکھنے ہیں یاد سے۔۔۔ چار گھنٹے کا ویٹ ہے بیچ میں۔۔۔ ٹائم پر آجائیں سب فلائٹس۔۔۔ اِنہی سوچوں کے درمیان برش کے پٹخنے کی آواز پر وہ زبردست چُونک گیا تھا۔

کچھ لمحے اُسے یقین نہ آیا کہ اماں جو ہر مسئلے کا حل پلک جھپک میں نکال لیتی ہے، آج ایک برش سے عاجز کیسے آگئی۔

"رہنے دو اماں۔ برش ہی تو ہے۔ کر لُوں گا خود صاف۔"

"ہاں جیسے پہلے تُو نے صاف رکھا ہوا ہے۔ دیکھ کیسے پھنسے ہوئے ہیں اندر۔ نہیں نکل رہے۔ ایسے ہی رہے گا یہ۔ اور شام کو تُو نے چلے جانا ہے۔"

اماں نے سر اوپر اُٹھائے بغیر ناراض لہجے میں جواب دیا اور برش میں پھنسے بالوں کو ایسے زور سے کھینچنے لگی جیسے کوئی اپنے بال نوچ رہا ہو۔ اگلے ہی لمحے اُس نے برش دوبارہ زمین پر مارا

"نہیں نکلیں گے۔ نہیں نکلیں گے۔ چُھٹی بھی ختم ہو گئی ہے تیری۔ اور شام کو تُو نے چلے جانا ہے۔ پتا نہیں کتنے سالوں کے لئے۔۔۔"

بولتے بولتے اماں کی آواز غائب ہو گئی۔ ایک بھاری پتھر راحیل کے گلے میں آ اٹکا۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے ماں کی طرف دیکھا اور نظریں ہٹا لیں۔ جُھکے ہوئے تر چہرے کو اِس سے زیادہ دیکھنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اچانک اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ماں کے ہاتھوں پر رکھ دئے۔ بوڑھے ہاتھوں کی جُھریوں سے سجی کُھردری جِلد اور پھولی ہوئی نسوں میں ناچتا ارتعاش کسی گہرے درد کی طرح اُس کے وجود میں اُتر گیا۔

اُس نے اپنی آواز پر قابو پایا

"اماں، بس یہ آخری بار ہے۔ پھر پکا واپس آ جاؤں گا۔ تُو ایسا کر یہ برش رکھ لے۔ آرام سے صاف کرنا۔ میں آؤں گا تو لے لوں گا"۔

بوڑھی نسوں میں جاری بے چین رقص اچانک تھم گیا۔

"سچ؟"

اماں نے نظریں اُٹھائے بغیر پوچھا اور انتہائی شفقت سے برش میں پھنسے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

■

ہوم ورک

پیارے اللہ میاں،

میں بالکل خیریت سے ہوں، اور بہت خوش ہوں۔ آج اسکول میں مِس نے کام دیا کہ اپنے کسی پیارے کو خط لکھیں اور اپنے دن کا احوال بتائیں۔ میں نے مِس سے پوچھا "احوال" کیا ہوتا۔۔۔

بیٹا یہ کتنے کا ہے مرنڈا؟

پانچ روپے کا ایک۔

دو دے دو۔

میں نے مِس سے پوچھا "احوال" کیا ہوتا ہے۔ مِس ہنس پڑیں۔ آپ نے یہ لکھنا ہے کہ آپ کا دن کیسا گزرا۔ پیارے اللہ میاں، میرا دن بہت ہی اچھا گزرا۔ میں نے صبح اُٹھ کر فجر کی نماز پڑھی۔ پھر چائے پی اور ابو کے ساتھ ریڑھی نکالی۔ پھر ہم منڈی گئے اور ریڑھی بھر کر سبزیاں لے آئے۔ گھر آکر میں نے یونیفارم پہنا۔ امی نے مجھے دو رس دیے اور کہا جلدی جاؤ پھر دیر نہ ہو جائے۔ میرا اسکول دُور ہے۔ آدھا گھنٹہ چلنا پڑتا ہے۔ امی کہتی ہے تیرا شکر ادا کروں کہ اسکول والوں نے مجھے جگہ دے دی۔ اُنھوں نے میری فیس بھی آدھی رکھی ہے۔ امی کہتی ہے نیک لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں اور تُو سب کو دیکھتا ہے کون لالچ کرتا ہے اور کون شکر۔ امی تو ہر وقت تیرا شکر کرتی ہے۔ تُو پیار سے دیکھتا ہے نا اُسے؟ میرے نئے یونیفارم اور کتابوں کے لئے امی نے اپنی دوسری بالی بھی۔۔۔

اوئے کیا لکھ رہا ہے؟ ہم فُٹ بال کھیلنے لگے ہیں دوسری گلی میں۔ آجا۔

نہیں۔ تم کھیلو۔ پچھلی بار اِتنے سارے مرنڈے چوری ہو گئے تھے۔ امی بہت خفا ہوئی تھی۔

امی نے اپنی دوسری بالی بھی بیچ دی ہے۔ کہہ رہی تھی اکیلی بالی میرے کس کام کی۔ نانی اماں نے دی تھیں امی کو۔ شاید اِس لئے پہلی بالی بیچتے ہوئے رو پڑی تھی۔ لیکن آج بہت خوش تھی۔ میں نے اپنا ٹیسٹ رزلٹ لا کر دکھایا۔ امی کو پڑھنا نہیں آتا۔ میں نے خود سُنایا، "دس باٹا دس، شاباش"۔ امی سُن کر رو پڑی اور مجھے بہت زیادہ پیار کِیا۔ پھر ابو بھی ریڑھی لے کر گھر آگئے۔ ہم نے اکٹھے کھانا کھایا اور ابو دوبارہ

سبزیاں بیچنے چلے گئے۔ امی نے میرا امرنڈوں کا ڈبہ مجھے دیا اور میں اِدھر بازار کے کنارے اِسے لگا کر بیٹھ گیا۔ اور اب یہ ہوم ورک کر رہا ہوں۔ بس یہ تھا میرے دن کا احوال۔ اب میں دوسرے ہوم ورک کروں گا اور پھر شام کو گھر چلا جاؤں گا۔

(اور ہاں، ایک بات نہیں لکھی، پر تُو تو جانتا ہی ہے، آج پھر میں نے اپنا ایک رس دو روپے کا بیچ دیا۔ اب سو روپے ہو گئے ہیں میرے پاس۔ پتا نہیں دو بالیاں کتنے کی آئیں گی۔ تُو مدد کرے گا نا میری؟)

■

گود

پارک پہنچتے ہی بچی نے جھولا لینے کی ضد شروع کر دی تھی۔

اُس نے بہت سمجھایا تھا، "چھوٹی ہو۔۔۔۔گر جاؤ گی"، پر بچی اپنی ضد کی پکّی تھی۔ چار و ناچار وہ اُسے جھولوں کے قریب لے آئی تھی اور ایک پینگ میں بٹھا کر بہت آرام سے جھولا دینے لگی تھی۔ جھولے کے ہمراہ حرکت کرتے کرتے اُس کا ذہن پارک سے نکل کر گزشتہ برسوں کے واقعات میں غوطے کھانے لگا تھا

"بانجھ"!

"منحوس کہیں کی"

"کب تک انتظار کرے گا۔۔۔۔ نکال دے گھر سے اِسے۔۔۔۔ دوسری لے آ"

"یہ گود نہ ہوئی ہری۔ بنجر ہے"

"خاندانی مسئلہ نہ ہو۔ پہلے نہیں چُھوٹا کسی نے"

نہ جانے یہ تلخ یادیں کتنی دیر تک اُس کا دل جلاتی رہتیں مگر خوش قسمتی سے چند ہی لمحوں میں بچی کی ہنسی اُسے اپنی طرف کھینچ لائی تھی اور اب وہ اُسے جھولا جُھلانے اور اُس سے اپنے طور پر باتیں کرنے میں مگن تھی۔ اِس سب کے دوران اُسے محسوس ہی نہ ہوا کہ اُس کے ارد گرد کا منظر تیزی سے بدلتا جا رہا تھا۔ ایک بے چین خاموشی جھولوں پر قبضہ کر چکی تھی۔ غیر ارادی طور پر اُس نے رُک کر ایک لمحے کے لئے اپنے اِرد گرد دیکھا۔ لوگ اپنے بچوں کو لے کر اُس سے دُور ہٹ چُکے تھے۔ چاروں طرف سہمی ہوئی پریشان آنکھیں اُسے تکے جا رہی تھیں۔ اُسے ابھی اِس پریشانی کی وجہ سمجھ نہ آ سکی تھی کہ اچانک واپس آتا جھولا اُس کے پہلو سے ٹکرایا اور اِس میں پڑی پلاسٹک کی گُڑیا مُنہ کے بَل ریت پر گر پڑی۔ بے اختیار اُس کے مُنہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور اگلے ہی لمحے وہ اپنی بچی کو اُٹھا کر بے چینی سے ٹٹول ٹٹول کر پوچھ رہی تھی

"لگی تو نہیں؟ لگی تو نہیں؟"

"نہیں ماما!"

■

مِسز نسیم

یہ واقعہ میری پی ایچ ڈی ریسرچ کے دنوں کا ہے۔ میں نے بہت غور و فکر، جائزے، اور اساتذہ سے مشاورت کے بعد اپنے تھیسز کا موضوع چُنا تھا
"Man's Need for Paranormal / پیرانارمل کی انسانی ضرورت"۔
میرا ارادہ ہمارے معاشرے میں مبینہ پیرانارمل واقعات کو لے کر ایسے عوامل پر غور کرنے کا تھا جو انسانی نفسیات کو پیرانارمل کی تخلیق اور قبولیت پر مائل کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں میرے سامنے آنے والے کیسز میں سب سے پہلا کیس مسز نسیم کا ہی تھا اور اِس سے میرا تعارف ایک خط کی صورت میں ہوا۔ اُن دنوں میں نے ایک مقبول میگزین میں اپنی ریسرچ کے حوالے سے اشتہار دے رکھا تھا۔ مسز نسیم کی بیٹی سے ملنے والا خط اِسی اشتہار کے جواب میں تھا۔ ابتدائی دلچسپی کے باوجود میں اِس کیس پر تفصیلی کام نہ کر سکا اور نہ ہی اِسے اپنے تھیسز میں شامل کر پایا۔ اِس کی وجہ میرے اشتہار کے جواب میں ملنے والے کیسز کی بڑی تعداد اور وقت کی کمی

تھی۔ میں اپنی ریسرچ میں کافی حد تک کامیاب رہااور میرے کام کو علم النفسیات کے حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ مسز نسیم کیس کا خیال پی ایچ ڈی کے اختتام تک میرے ذہن سے محو ہو چُکا تھا۔ مگر آخری دن جب میں یونیورسٹی میں اپنا دفتر خالی کرنے آیاتواِس کیس کی فائل ایک بار پھر نظروں کے سامنے آگئی۔ ایک میز کے نیچے پرانی فائلوں کے ڈھیر سے الگ تھلک پڑی گہرے سُرخ رنگ کی فائل مجھے گھور رہی تھی۔ فائل اُٹھا کر اِس پر پڑی گرد کو عادتاً ایک زوردار پھونک سے ہٹایا ہی تھا کہ میں بُری طرح چونک اُٹھا۔ اور پھر فائل میز پر رکھ کر جوں جوں اوراق پلٹتا گیا جسم میں سنسنی پھیلتی گئی۔ میری ہمیشہ سے یہی رائے رہی ہے کہ پیرانارمل کا احساس انسانی نفسیات کی تخلیق ہے۔ پر اُس دن جو میں نے دیکھاوہ میں آج تک پوری طرح سمجھ نہیں پایا۔ کیا میں خود اِس کیس کا حصہ بن گیا تھا؟ آج پہلی بار مکمل تفصیلات سب کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ شاید پڑھنے سُننے والے مجھ سے بہتر سمجھ سکیں۔

ا۔ بیٹی کا بیان (خط)

"سلام مسنون،

آپ کا اشتہار نظر سے گزرا۔ معلوم نہیں آپ سے رابطہ کرنا درست ہے یا نہیں۔ تفصیل میں جانے سے پہلے یہ واضح کرنا چاہوں گی کہ ہماری فیملی کسی طرح بھی توہمات پرست نہیں رہی۔ مگر اب کچھ واقعات نے ذہن میں بے یقینی کا بیج بو دیا ہے۔ آج سے تقریباً ایک برس قبل میرے والد جناب نسیم اختر کا انتقال ہوا اور یوں والدہ کے ساتھ اُن کی عمر بھر کی رفاقت اختتام کو پہنچی۔ میرے والدین آپس

میں کزن تھے اور بچپن سے ہی ایک چھت کے نیچے رہے۔ جب اِن کی شادی ہوئی تو والد کی عمر پندرہ اور والدہ کی چودہ برس تھی۔ خاندان میں سبھی اِس رشتے سے خوش تھے اور دھیرے دھیرے سبھی نے جان لیا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر بالکل نہیں رہ سکتے۔ یہ کوئی وقتی لگاو نہیں تھا بلکہ ہم نے بھی جب سے ہوش سنبھالا، دونوں کو ساتھ اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہی دیکھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے میں گُم ہو چکے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے سایہ، رحمت اور جائے سکون بن چُکے ہیں۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد جب ابو گاوں سے شہر منتقل ہوئے تو امی کو ساتھ ہی لائے۔ ابو کی عادت تھی کہ گھر داری کے حوالے سے امی کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتے اور اُنہیں کسی قسم کی مشکل کا شکار نہ ہونے دیتے۔ امی کی کسی بھی پریشانی کو فوراََ بھانپ لیتے اور پھر حل کیے بغیر آرام سے نہ بیٹھتے۔ دوسری طرف امی بھی اُن کی خدمت میں کوئی کمی نہیں چھوڑتی تھیں۔ ہمارے کاموں کے ساتھ ساتھ ہر لمحے اُن کے آرام کا خیال رہتا۔ آخری دنوں میں ابو بیمار پڑے تو امی اُن کے بستر سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ ابو کی بیماری اور بڑھتی کمزوری کو دیکھ کر سخت غمگین ہو جاتیں اور کبھی غم کی شدت میں کہہ دیتیں "آپ کو کچھ ہو گیا تو میں نے بھی نہیں بچنا" تو ابو کا مسکراہٹ بھرا جواب یہی ہوتا "یوں نہیں، بلکہ یوں کہو کہ جب تک ہم میں سے ایک زندہ ہے دوسرا ابھی نہیں مر سکتا"۔

ابو کی وفات کے بعد ہم پریشان تھے کہ امی اُن کے بغیر کیسے رہیں گی۔ پر امی کے چہرے پر ایک اطمینان رہتا، جیسے کوئی بڑی تبدیلی نہ آئی ہو۔ ہم بہن بھائیوں نے بہت کوشش کی کہ امی ہم میں سے کسی کے پاس رہ لیں، مگر وہ ہر بار یہ کہہ کر انکار کر

دیتیں کہ تمہارے ابو اور میں پینتیس سال پہلے اکٹھے اِس گھر میں آئے تھے، اب اُنہیں یہاں اکیلا کیسے چھوڑ دُوں۔ ابو کی وفات کے فوراً بعد پہلے چند ہفتے مَیں ہی امی کے پاس رہی۔ غالباً وفات کا پانچواں دن تھا جب مجھے پہلی بار کچھ محسوس ہوا۔ مہمان رشتے دار سب جا چُکے تھے۔ رات گئے تک میں امی کے بستر پر بیٹھی اُن سے باتیں کرتی رہی۔ اِس دوران امی کی آنکھ لگ گئی اور میں لائٹ بند کر کے دبے قدموں کمرے سے باہر نکلی اور بہت خاموشی سے دروازہ بند کرنے لگی۔ ابھی دروازہ مکمل بند بھی نہیں کیا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ امی نے صرف چادر اوڑھی ہوئی ہے اور رات میں سردی بڑھ جاتی ہے۔ نکلتے ہوئے میری نظر کمبل پر پڑی تھی جو دن بھر پیٹی کے اوپر سلیقے سے رکھا رہتا تھا۔ سوچا کمبل پیٹی سے اٹھا کر بستر پر رکھ دوں۔ اِس خیال سے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں بُری طرح کانپ اٹھی۔ کمبل انتہائی نفاست سے امی کے اوپر پھیلا ہوا تھا، اور وہ بالکل پہلے کی طرح سکون سے سو رہی تھیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ سکی کہ یہ کیسے ہوا۔ اِس کے باوجود اُس رات میں نے اِس واقعے پر مزید نہیں سوچا اور شاید دوبارہ کبھی سوچتی بھی نہ۔ مگر پھر دھیرے دھیرے ایسے واقعات بڑھتے چلے گئے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو مزید بات کی جا سکتی ہے۔"

۲۔ نواسے کا بیان (ریکارڈنگ)

"کہاں سے بتانا شروع کروں آپ کو۔ مجھے تو اب نانی کے گھر سے بہت ڈر لگتا ہے۔ امی کہتی ہیں تو چلا جاتا ہوں۔ پر اب میں رات بالکل نہیں ٹھہرتا وہاں۔ نانا ابو فوت ہوئے تو شروع شروع میں ہفتے اتوار کو رُک جاتا تھا۔ بہت پیار کرتی ہیں نانی اماں، پر

اُس گھر کی بہت سی چیزیں اب مجھے سمجھ نہیں آتیں۔ اکثر میری رات میں آنکھ کُھل جاتی اور نانی اماں کے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی ہوتی تھی۔ میں سمجھتا تھا شاید نیند میں بول رہی ہوں گی۔ پر بولنے کا انداز نیند والا نہیں ہوتا تھا اور کمرے سے آنے والی آواز بھی ایک نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ دروازے سے کان لگا کر تھوڑا سا سُنا۔ نانی اماں دن بھر کے واقعات، اور ہماری باتیں بتا رہی تھیں۔ اُن کی بات کے بیچ بیچ کسی دوسری آواز کا ہلکا سا شائبہ ہوتا تھا۔ میں اِسے اپنے ذہن کی شرارت سمجھتا رہا۔ پھر ایک رات آنکھ کُھلی تو نانی اماں کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کُھلا ملا۔ نانا ابو کی ایک ہلنے والی کرسی ہوتی تھی جس پر ہم بچپن میں شوق سے جھولا کرتے تھے۔ میں نے ہلکا سا اندر جھانکا تو نانی اماں بستر پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اُن کی پشت دروازے کی طرف تھی اور چہرہ ہلنے والی کرسی کی طرف اور کُرسی دھیرے دھیرے ہلے جا رہی تھی۔ جب تک میں دیکھتا رہا کرسی ہلتی رہی، نانی اماں باتیں کرتی رہیں۔ سردیوں کی رات تھی۔ پنکھے اور کھڑکیاں سب بند تھے۔ اُس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ ہلتی ہوئی کرسی کا ہی سوچتا رہا۔ اُس کے بعد سے میں وہاں رات نہیں ٹھہرا۔ "

۳۔ پلمبر کا بیان (ریکارڈنگ)

"نسیم صاحب سے کئی برس کا تعلق تھا۔ گھر کا کوئی بھی کام ہوتا پلمبنگ اور بجلی سے متعلق تو میری دکان پر آ کر مجھے لے جاتے۔ وہ میرے کام سے مطمئن تھے اور معاوضہ بھی مناسب دیتے تھے۔ تقریباً ڈھائی سال پہلے میں نے اپنی دکان

اندرون شہر منتقل کر لی تو اُن کا آنا جانا کم ہو گیا۔ پھر بھی فون کر کے کبھی بُلا لیتے تھے۔ کچھ ماہ پہلے کی بات ہے میں نے صبح دکان کھولی ہی تھی کہ اُن کی کال آ گئی۔ کہنے لگے آصف بھائی گیزر شام سے کام نہیں کر رہا اور سردی بہت ہے۔ اگر آج ہی آ کر دیکھ لیں تو اچھا ہو گا۔ میں نے اپنا سامان پکڑا اور موٹر سائیکل پر نسیم صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ گھنٹی دی تو چھوٹی بی بی نے دروازہ کھولا اور مجھے حیرانی سے دیکھنے لگیں۔ میں نے پوچھا بی بی جی نسیم صاحب باہر گئے ہیں کیا؟ میری بات پر رونے لگیں اور بولیں آصف بھائی ابو کا تو سال پہلے انتقال ہو گیا۔ میں کچھ دیر ہکا بکا کھڑا رہا، پھر ہمت کر کے بولا "پر بی بی جی ابھی تو اُن کی کال آئی مجھے، کہہ رہے تھے گھر پر کام ہے گیزر شام سے خراب ہے"۔ بی بی جی حیرت بھری نظروں سے مجھے تکنے لگیں اور بولیں "گیزر تو واقعی شام سے خراب ہے پر آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی، شاید کسی اور نے اپنے کام سے کال کی ہو؟" میں نے کہا میں نسیم صاحب کی آواز اچھی طرح پہچانتا ہوں، نمبر بھی اُنہیں کا تھا۔ پھر بی بی جی کی بڑھتی پریشانی دیکھ کر میں نے اصرار نہیں کیا اور کہا کہ اب آیا ہی ہوں تو گیزر ٹھیک کر دیتا ہوں۔ بس پھر گیزر ٹھیک کر کے واپس آ گیا اور دوبارہ اِس پر نہیں سوچا۔ اب چھوٹی بی بی کے کہنے پر آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

۴۔ راقم کا بیان (تحریری)

جیسا کہ میں شروع میں بیان کر چکا ہوں، مسز نسیم کے کیس پر ابتدائی معلومات اکٹھی کرنے کے بعد میں مزید کام نہیں کر سکا۔ اِس کیس کی فائل میرے دفتر میں کہیں

پڑی رہی۔ یونیورسٹی میں آخری دن دفتر خالی کرتے ہوئے ایک بار پھر یہ فائل میرے سامنے آ گئی۔ میں نے اِس کیس کا نام شروع سے ہی "بیوہ نسیم" رکھا تھا۔ پر اُس دن فائل سے گرد ہٹاتے ہی میرے چُونک اٹھنے کی وجہ یہ تھی کہ فائل کور پر "بیوہ" کو کاٹ کر اوپر بڑی نفاست سے "مسز" لکھ دیا گیا تھا۔ لکھائی میری نہیں تھی۔ میرے علاوہ اِس دفتر کی چابی کسی کے پاس نہیں تھی اور نہ ہی اس کیس کے حوالے سے کسی اور کو معلوم تھا۔ میں بے یقینی اور تجسس کی کیفیت میں تیز تیز فائل کے اوراق پلٹنے لگا۔ اور جب تک پلٹتا رہا میرے اوپر کئی رنگ آتے جاتے رہے۔ کبھی حیرانی کبھی شک اور کبھی مکمل بے یقینی۔ اِن سب کے ساتھ ایک بے نام سے خوف کی سرد لہریں جسم میں دوڑتی رہیں۔ فائل میں ہر جگہ "بیوہ نسیم" کو کاٹ کر "مسز نسیم" کر دیا گیا تھا۔ فائل بند کر کے کچھ دیر سوچتا رہا، پھر میرا دھیان اپنے لیپ ٹاپ کی طرف گیا۔ پی ایچ ڈی کے دوران میری عادت تھی کہ روز کا کام ایک انٹرنیٹ سروَر پر اپلوڈ کر دیتا تھا تا کہ کچھ ضائع نہ ہو۔ اب میں بَیک اَپ سرور میں موجود بیوہ نسیم کیس کی فائلیں کھول کر ہر اِک کی ایڈیٹ ہسٹری کا جائزہ لینے لگا۔ جوں جوں تفصیلات کُھلتی گئیں میرا اپنی آنکھوں اور اپنے فہم پر یقین کمزور پڑتا گیا۔ ایڈیٹ ہسٹری کے مطابق تمام فائلیں اپلوڈ ہوتے ہی، ایک سیکنڈ کے اندر اندر ایڈیٹ ہوتی چلی گئی تھیں، پہلے ورژن میں "بیوہ" اور دوسرے میں "مسز"۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکا کہ یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔

■

وقار

جمعے کی شب آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر سترہ سالہ احمد دین ولد محمد دین سکنہ پاک پورہ کو محلے والوں کے سامنے گھونسوں، لاتوں، اور گالیوں کی مدد سے وین میں لادا گیا اور پھر اِسی اہتمام کے ساتھ تھانے میں لا کر ایک جیل سَیل میں دھکیل دیا گیا۔ رات بھر وقفے وقفے سے پَیٹ کے بل لِٹا کر اور نیم برہنہ حالت میں خصوصی چمڑے کے جوتے سے اُس کی خاطر مدارات کی گئی۔ بیچ بیچ میں تھانیدار اور سپاہی حسبِ استطاعت ٹھڈے مارتے اور فحش گالیاں دیتے رہے۔

احمد دین ولد محمد دین سکنہ پاک پورہ پر الزام تھا کہ اُس نے کرکٹ ورلڈ کپ کے ایک میچ کے دوران دشمن ملک کی ٹیم کا جھنڈا کمرے کی کھڑکی سے لٹکا رکھا تھا۔ تھانے میں چند دن کی اچھی طبیعت صفائی کے بعد اُس سے حلفیہ بیان لکھوایا گیا

"مَیں احمد دین ولد محمد دین سکنہ پاک پورہ، مکمل ہوش و حواس میں اور بغیر کسی زبردستی کے حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ایک میچ کے دوران دشمن ملک کا جھنڈا کھڑکی سے لٹکایا۔ میرے اِس فعل نے بیس کروڑ کی اِس باعزت قوم کے وقار کو پامال کِیا۔ میں آئندہ ایسی کسی بھی حرکت سے دُور رہوں گا۔"

اِس کے بعد اُسے تھانے سے باہر دھکیل دیا گیا۔

■

٦

یقین

"خون مانگتے ہو، خون دیں گے ! جان مانگتے ہو، جان دیں گے !، کلیجہ مانگتے ہو، کلیجہ دیں گے "!

مجمع کئی دن کا بھوکا تھا۔ فوراً سے پہلے آگ جلائی گئی اور اُس پر دیگ چڑھا دی گئی۔ پھر سب للچائی نگاہوں سے سٹیج پر کھڑے ضخیم و حجیم لیڈر کو دیکھنے لگے۔

■

۷

دورَنگی

اُس کے ایک ہاتھ پہ مہندی تھی اور ایک پر خون۔

"ضرور بھاگ کے شادی کی ہو گی۔ گھر والوں نے مار کر اِدھر پھینک دیا۔"

"کیا پتا دھندہ کرتی ہو، کسی رئیس زادے نے اپنا راز چُھپایا ہو"

"بھائی اغوا کا کیس بھی ہو سکتا ہے، گھروں میں کب بیٹھتی ہیں اب لڑکیاں"!

"ہو نہ ہو کسی آوارہ لڑکے نے محبت کا جھانسا دے کر بھگایا ہے۔ نجانے پیسا زیور کیا کچھ لے کر فرار ہو گیا۔"

حسبِ عقل اور توفیق جس کے ذہن اور منہ میں جو آرہا تھا بکے جا رہا تھا۔ اپنے کردار میں اس قدر دلچسپی لیتے مجمعے کے حَبس اور کوڑے کی رنگا رنگ غلاظت کے بیچ بظاہر بے حرکت و بے جان عورت ذات دھیمی دھیمی سانسوں میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔

■

بَوکاٹا

ابھی چند دن پہلے ہی کی بات ہے کہ میں نے اُسے موٹر سائیکل پر فرائے بھرتے دیکھا تھا۔ بیٹے کی پیدائش کی خوشی اُس سے سنبھالی نہیں جارہی تھی۔ وہ میری دوکان کے سامنے موٹر سائیکل سے تقریباً اُڑتے ہوئے اُترا تھا

"پہلوان جی، تیس کلو دیسی گھیو کے لڈو تیار کرنے ہیں۔ پیسے بعد میں دُوں گا"

اور آج وہ شاید رقم ہی ادا کرنے آرہا تھا۔ دوکان کے باہر بیٹھے میں نے اُس کے موٹر سائیکل کو دُور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ پھر خدا جانے کہاں سے "بَوکاٹا" کا شور بلند ہوا اور کب کانچ اور کیمیکل سے لیس ڈور اُس کے راستے میں تَن گئی۔ ذہن ماؤف ہو چُکا ہے اور بس اتنا معلوم ہے کہ میں کانپتے ہاتھوں سے وَن فائیو مِلا رہا ہوں اور اُس کا کٹا ہوا

سر مجھے گھورے جا رہا ہے۔

■

۹

تَسلّی

"بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں"!!

"قسمت والوں کو ملتی ہیں"!!

"اللہ نصیب اچھے کرے"!!

جب دسویں مہمان نے بھی ایسی ہی باتیں دہرائیں تو حامد علی سمجھ گیا کہ کچھ مسئلہ ہے۔

■

۱۰

سُنہری صندوق (بچوں کی کہانی)

ایک دفعہ کا ذکر ہے لاہور کے ایک چھوٹے سے محلے کے ایک چھوٹے سے گھر میں ایک چھوٹی سی لڑکی رہتی تھی جس کا نام زرّین تھا۔ آج زرّین بہت اداس تھی۔ وہ والی اداس نہیں جو آپ آئس کریم نہ ملنے سے ہو جاتے ہیں۔ زرّین اداس تھی کیونکہ آج اُس کے بابا ایک ماہ کی چھٹیاں گزار کر باہر واپس جا رہے تھے۔ ارے گھر سے باہر نہیں، ملک سے باہر۔ چھٹیوں کے علاوہ پورا سال زرّین کے بابا اُس سے کہیں دُور ہی رہتے تھے، اور یہی ایک ماہ ہوتا تھا جس میں وہ اُن کے ساتھ باتیں کرتی، کھیلتی، پارک جاتی، آئس کریم کھاتی۔ ویسے آئس کریم تو وہ ماما کے ساتھ بھی خوب کھاتی تھی پر بابا کے ساتھ اِن سب کاموں کا اپنا ہی مزہ تھا۔ اِن چھٹیوں میں اگر ایک خرابی تھی تو وہ یہ کہ یہ چھٹیاں ختم بہت جلدی ہو جاتی تھیں اور زرّین کی ہزاروں چُپکے چُپکے کی گئی دعائیں اِنہیں کھینچ کر "ہمیشہ ہمیشہ" میں تبدیل نہیں کر پاتی تھیں۔ پچھلے

سالوں کی طرح آج بھی چھٹیوں کا آخری دن آ پہنچا تھا اور وہ صبح سے ہی بابا کے ساتھ نتھی ہو گئی تھی۔ بابا کے بار بار گلے لگانے اور اگلی چھٹیوں کے لئے فرمائشوں کی فہرست مانگنے کے باوجود تقریباََ سارا دن ہی بوجھل گزرا تھا۔ اور اب گھر کے باہر ماموں کی گاڑی تیار کھڑی تھی جس میں زرّین، ماما اور ماموں نے بابا کو ایئرپورٹ چھوڑنے جانا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زرّین سب کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئی اور راستے میں گزرنے والی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ ائیرپورٹ پر بابا کو خدا حافظ کہتے ہوئے اُس کے ذہن میں ماما کا دیا ہوا سبق گھوم رہا تھا("تم اب بڑی ہو گئی ہو، بڑے بچے مضبوط ہوتے ہیں، روتے نہیں ہیں")۔ پہلے تو زرّین نے اپنے مضبوط ہونے کا بھرپور ثبوت دیا، پر جب اُس نے دیکھا کہ مُڑتے مُڑتے ایک لمحے کے لئے بابا بھی چھوٹے بچے بن گئے تھے تو اُس سے رہا نہ گیا اور ماما سے چپک کر زور زور سے رونے لگی۔

گھر واپس آ کر وہ اپنے کمرے میں روتے روتے سو گئی۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اُس کی آنکھ کھلی۔ اُسے ایسے لگا جیسے ایک چھوٹا سا پرندہ اُس کی کھڑکی میں چہچہا رہا ہے۔ پر جلد ہی پرندے کی آواز غائب ہو گئی۔ زرّین نے منہ چادر سے نکال کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پر اب اُس کی توجہ پوری کی پوری اُس لکڑی کے ڈبے کی طرف تھی جو کھڑکی کے قریب پڑا ہوا تھا۔ لکڑی کے تختوں کے بیچ کہیں کہیں روشنی کی سنہری کرنیں باہر جھانک رہی تھیں۔

"یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟"، زرّین سوچنے لگی۔ پہلے تو اُسے ڈبے سے خوف آیا مگر جلد ہی ایک اور خیال اُس کے ذہن میں اُبھرنے لگا۔

"ضرور بابا نے میرے لئے تحفہ چھوڑا ہو گا"!

وہ بستر سے نکلی اور دبے پاؤں چمکتے ڈبے کی طرف بڑھی۔ تختوں کے بیچ سے نکلتی روشنی اب اُسے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ قریب پہنچ کر اُس نے بڑی احتیاط سے ڈبے کو کھولا۔ روشنی کی تیز کرنیں اُس کی آنکھوں میں زور سے چبھیں۔ ایک لمحہ آنکھیں بند رکھنے کے بعد اُس نے دوبارہ کھولیں تو اب اُسے بہتر طریقے سے نظر آ رہا تھا۔ سوچے سمجھے بغیر اُس نے پہلے ایک اور پھر دوسرا پاؤں ڈبے کے اندر رکھا اور اگلے ہی لمحے مکمل اندھیرا ہو گیا۔ زرّین چپ چاپ اپنی جگہ کھڑی رہی۔ کچھ دیر میں اُس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہونے لگیں تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ اندھیرے میں ابھی صرف اُسے ایک کونے میں دیوار سے لگا ڈیسک ہی نظر آ رہا تھا۔ ڈیسک پر دائیں جانب شاید کسی تصویر کا بڑا سا فریم پڑا تھا۔ کمرے کا منظر اُسے کہیں دیکھا دیکھا لگ رہا تھا۔ جیسے کسی پینٹنگ یا خواب میں دیکھا ہو۔ وہ خاموشی سے ڈیسک کی طرف بڑھی اور فریم میں لگی تصویر کو غور سے دیکھنے لگی۔ ایک بچی اپنے باپ کے کندھوں پر بیٹھی تھی۔ تصویر پہچان کر زرّین اچانک اُچھل پڑی

"ہائے، یہ تو بابا کا کمرہ ہے"!

اِس سے پہلے کہ زرّین مزید کچھ سوچ پاتی کمرے کا دروازہ باہر سے کُھلا اور اُس کے بابا اپنا سامان سنبھالے اندر داخل ہوئے۔ زرّین تیزی سے دروازے کی طرف لپکی تا کہ پورے زور سے بابا سے لپٹ جائے، پر وہ جیسے کھڑکی میں روشنی کی طرح اُن کے اندر سے گزر گئی۔ بابا اُس کی اِس حرکت سے بے خبر آگے بڑھے اور اپنا بیگ اور سوٹ کیس کمرے کی ایک جانب رکھنے لگے۔ تب زرّین کو احساس ہوا کہ بابا اُسے نہیں دیکھ سکتے۔ سامان سلیقے سے رکھنے کے بعد بابا نے سب سے پہلے ڈیسک پر پڑا فریم اُٹھایا اور ایک صوفہ نما سیٹ میں بیٹھ کر فریم میں لگی تصویر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ ایک بار پھر زرّین کا دل چاہا کہ وہ اُچھل کر بابا کے گلے لگ جائے۔ پر اب وہ جان چکی تھی کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اچانک پرندے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور زرّین کی آنکھ کُھل گئی۔ وہ اپنے بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ پر اب سنہری صندوق کمرے میں نہیں تھا۔ اُس نے صبح ماما سے اِس کا ذکر بھی نہ کیا۔ اگلی رات دوبارہ پرندے کی چہچہاہٹ نے اُسے جگا دیا اور سُنہری صندوق ایک بار پھر اُس کے کمرے میں تھا۔ اِس کے بعد تو باقاعدہ سلسلہ چل نکلا۔ ہر رات وہ سنہری صندوق میں اترتی اور چند لمحوں کے لئے بابا کو دیکھ آتی۔ یہ لمحے اُسے بہت ہی پیارے تھے اور وہ روز اِس جھلک کا انتظار کرتی۔ ماما کو بتانے کا خیال جب بھی آتا تو وہ اِس خیال کو یہ سوچ کر ترک کر دیتی کہ کہیں سنہری صندوق اُس سے چِھن ہی نہ جائے۔

یونہی ایک رات جب وہ پہنچی تو بابا فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

"بس میں نے مینیجر سے کہہ دیا ہے اگر اُس نے اجازت نہ دی تو میں پکا ملک واپس جا رہا ہوں"

خوشی کے مارے زرّین کی چیخ نکل گئی۔ اُس نے پہلے تو فوراََ اپنے منہ پر ہاتھ رکھا پر اگلے ہی لمحے خود پر ہنسنے لگی

"بابا کون سا سُن سکتے ہیں میری آواز"!

اگلے کئی روز اُس نے اللہ میاں سے خوب دعائیں کیں۔ سوتے جاگتے، ماما کے ساتھ مصلّے پر بیٹھے، چلتے پھرتے،

"یا اللہ مینیجر انکل اجازت نہ دیں، یا اللہ مینیجر انکل اجازت نہ دیں"

کئی دن یوں ہی گزر گئے اور ایک رات زرّین زور زور سے روتی ہوئی اُٹھی۔ اُس کی ماما دوڑتی ہوئی آئیں اور اُسے سینے سے لگا لیا۔

"کیا ہوا؟ ڈر گئی خواب میں؟"

ہچکیوں کے بیچ زرّین اپنی بات کرتی چلی گئی

"ماما میں نے اتنی زیادہ دعائیں کی تھیں۔ اتنی زیادہ۔ پر اللہ میاں نے میری دعا نہیں سُنی۔ بابا فون پر کہہ رہے تھے کہ مینیجر نے اجازت دے دی ہے۔ ماما اب وہ پکے واپس نہیں آئیں گے۔"

ماما حیران رہ گئیں۔

"تمہاری کب بات ہوئی بابا سے؟"

"ماما، وہ پرندہ، صندوق، روشنی، بابا"

ماما کو سب کچھ بتانے کی کوشش میں زرّین کچھ بھی ٹھیک سے بتا نہ پا رہی تھی۔

"ارے تم نے ہماری باتیں سُن لی ہوں گی۔ کچھ دیر پہلے تمہارے بابا کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے اُنہیں فیملی ویزہ مل گیا ہے۔ اب وہ یہاں نہیں آئیں گے، ہم اُن کے پاس جائیں گے، اور پورا سال اُن کے ساتھ رہیں گے۔"

"پورا سال؟"

زرّین زور سے چلائی۔

"پورا سال"!

ماما بھی زرّین ہی کے انداز میں چہک اُٹھیں۔

اگلی رات معمول کے مطابق پرندے کی آواز سے زرّین کی آنکھ کُھلی۔ وہ اُٹھ کر ڈبے کی طرف بڑھنے ہی والی تھی کہ کچھ دیکھ کر دوبارہ بستر میں سمٹ گئی۔ آج کمرے میں کوئی اور بھی موجود تھا۔ ڈبے کے ایک جانب ایک بوڑھی عورت کھڑی

تھی، جس نے ایک بڑا سا سیاہ چوغہ پہن رکھا تھا۔ بڑھیا کے کندھوں پر ایک سبز چادر تھی جس میں بالکل روشنی کی کرنوں کی طرح دمکتی سُنہری پٹیاں دوڑ رہی تھیں۔ بڑھیا کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا تھا۔ زرّین کی طرف دیکھے بغیر وہ صندوق اُٹھا کر تھیلے میں ڈالنے ہی والی تھی کہ زرّین بے قابو ہو کر بول اُٹھی

"یہ میرے بابا اور میرا صندوق ہے، پلیز اِسے مت لے جاؤ"

اب پہلی بار بڑھیا زرّین کی جانب مُڑی۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی

"پر پیاری بیٹی اب آپ تو اپنے بابا کے پاس جا رہی ہو نا، آپ کو اِس کی کیا ضرورت"!

"تو آپ اِس کا کیا کرو گی؟"، زرّین سے رہا نہ گیا۔

"اب یہ میں کسی اور بچے کو دوں گی، جسے اِس وقت اِس کی ضرورت ہو"

اب زرّین کچھ دلیر ہونے لگی

"پر پلیز آپ یہ میرے پاس رہنے دیں نا"

معصوم التجا سُن کر بڑھیا کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی

"اچھا، ایک بات طے کرتے ہیں۔ میں اِسے تمہارے پاس چھوڑ دیتی ہوں۔ اور جب تک تم اسے اچھے کاموں کے لئے استعمال کرو گی یہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔ مگر جب۔۔۔"

"میں بالکل اچھے کاموں کے لئے استعمال کروں گی۔ پکا وعدہ۔"

زرّین کو معلوم تھا کہ کسی کی بات کاٹنا اچھی بات نہیں پر اِس وقت صبر ناممکن تھا۔

بڑھیا ایک بار پھر مسکرائی۔ اُس نے صندوق فرش پر رکھا اور پلک جھپک میں ایک چھوٹے سے پرندے میں تبدیل ہو کر کھڑکی سے باہر اُڑ گئی۔ بڑھیا کے جاتے ہی زرّین صندوق کی طرف لپکی۔ اُسے اپنے بابا کو دیکھنا تھا۔ پر اِس بار وہ ڈبے میں اُتری تو وہ بابا کے کمرے میں نہیں تھی۔ یہ جگہ بہت مختلف تھی۔ ایک تنگ سا حبس زدہ کمرہ جس کے ایک کونے میں چھوٹا سا دِیا پڑا تھا۔ کمرے کی دیواروں سے پینٹ اور پلستر جگہ جگہ اُکھڑے ہوئے تھے اور دو تین چارپائیاں دیواروں سے لگی ہوئی تھیں۔ اِن میں ایک چارپائی کے کونے پر ایک بچی بیٹھی رو رہی تھی۔ پاس بیٹھی اُس کی ماں اُسے دلاسا دے رہی تھی۔

"سب مذاق اُڑاتے ہیں میرا۔ 'گندے کپڑے، پھاٹا بیگ' کہتے ہیں مجھے"

گندے کپڑے، پھاٹا بیگ؟ زرّین چونک اُٹھی۔ یہ لڑکی زرّین ہی کی کلاس میں تو پڑھتی تھی۔

اگلے روز زرّین سکول گئی تو اپنی سب سے آگے والی سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے سب سے پچھلی صف میں سب سے الگ تھلگ بیٹھی پھٹے بیگ والی لڑکی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے زرّین کی طرف دیکھا جیسے ابھی زرّین "گندے کپڑے پھاٹا بیگ، گندے کپڑے پھاٹا بیگ" چلاتی ہوئی اُس کے پاس سے بھاگ جائے گی۔ پر زرّین کے منہ سے کچھ اور ہی نکلا

"تمہیں اشٹاپو کھیلنا آتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔۔م۔۔۔۔گر۔۔۔۔ٹھی۔۔ک۔۔۔سے۔۔۔نہیں"

لڑکی نے ٹوٹے الفاظ میں جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے، بریک میں کھیلیں گے۔ میں سکھا دُوں گی"

اور اُس دن زرّین اور پھٹے بیگ والی نے خوب اشٹاپو کھیلا، یہاں تک کہ اُن کے پاؤں دُکھنے لگے۔ چند دنوں میں زرّین کی دوسری سہیلیاں بھی پھٹے بیگ والی کے ساتھ کھیلنے لگیں اور پھر ایک دن زرّین اپنے بابا کے پاس چلی گئی۔

تو یہ تھی کہانی زرّین اور سنہری صندوق کی۔ کہتے ہیں کہ ایک طویل عرصہ باہر رہنے کے بعد زرّین پاکستان واپس لوٹ آئی۔ اُس نے بڑھیا سے کِیا اپنا وعدہ بھی پورا کیا اور سُنہری صندوق کو ہمیشہ اچھے کاموں کے لئے استعمال کیا۔ سُنا ہے اب وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہے اور کسی ایسے بچے کی تلاش میں ہے جسے وہ سنہری صندوق دے

سکے۔ اُس کے پاس ایک سبز رچادر بھی ہے جس میں دوڑتی سُنہری پٹیاں بالکل روشنی کی کرنوں کی طرح لگتی ہیں۔ لاہور میں ہی رہتی ہے۔ شاید آپ نے دیکھا ہو کہیں؟۔

■

نو افسانے،
ایک کہانی

اِبنِ مُنیب